سید ابوالخیر صاحب مودودی

ہندوستان کی معاشی حالت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر

II

کمپنی کے پانچ دور

یہ کمپنی کی تدریجی ترقی کا اجمالی تبصرہ تھا' جس سے آپ کو اس بات کا ایک سرسری اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کمپنی نے کس طرح ایک تاجر جماعت کی حیثیت سے بروز کیا۔ کس طرح تجارت کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت کے لیے فوجی قوتیں بہم کیں' کس طرح اپنی مختصر قوت سے زبردست حریفوں کا مقابلہ کرکے ان کو نیچا دکھایا' کس طرح ہندوستان کی صحیح صورت حال کو سمجھ کر دیسی قوتوں سے ٹکرائی اور ملک گیری کا کام شروع کرکے ایک صدی کے اندر اندر ہندوستان کی مالک بن گئی۔ فلسفہ تاریخ کے نقطہ نظر سے ان ڈھائی صدیوں کے واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کمپنی اس مدت میں اپنی تاریخ کے پانچ دوروں سے گزری ہے۔ یہ پانچ دور معہ اپنے نمایاں واقعات کے حسب ذیل ہیں:۔

پہلا دور

۱۶۰۰ء سے شروع ہو کر ۱۷۵۷ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں کمپنی اپنی

تجارت اور اس کی برتری کے لیے کوشش کرتی ہے اور بالآخر اپنے یورپین رقیبوں کو شکست دے کر بحرِہند کی تنہا مالک بن جاتی ہے۔

دوسرا دور

۱۷۵۷ء سے شروع ہو کر ۱۷۸۴ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کلائیو اور وارن ہسٹنگز کے جنگی اقدامات اور سیاسی دسائس کا زمانہ ہے۔ تاجروں کی ایک کمزور جماعت کو زبردست قوت بنا دینا اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

تیسرا دور

۱۷۸۴ء سے شروع ہر کر ۱۸۱۷ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو کارنوالس ولزلی اور لارڈ ہسٹنگز ہیں۔ اس زمانے میں کمپنی کا تجارتی اور سیاسی تفوق ایک مسلمہ واقعہ ہوچکا تھا۔ میسور کی فتح، مرہٹوں کا استیصال، مہاراشٹر کا الحاق، بھونسلا کا انجام اس دور کے اہم واقعات ہیں۔ جنھوں نے کمپنی بہادر کو ہندوستان کی شاہی قوت بنا دیا۔

چوتھا دور

۱۸۱۷ء سے شروع ہو کر ۱۸۳۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ امن و صلح، نظم و نسق، اصلاح و اقتصاد کا عہد ہے۔ مونرو، الفنسٹن اور بنٹنگ اس کے درخشندہ ستارے ہیں، اور اس بہتر سے بہتر نظام ملکی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جس کی ایک تاجر گورنمنٹ سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اس عہد کا آخری واقعہ انگلستان کے تخت پر ملکہ وکٹوریہ کا جلوہ گر ہونا اور لارڈ آکلینڈ کا گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آنا ہے۔

پانچواں دور

۱۸۳۶ء سے شروع ہو کر ۱۸۵۸ء پر ختم ہوتا ہے اور ہندوستان کی قسمت کو تاج برطانیہ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہندوستان نے ایک غیر ملکی طاقت کو اپنے اوپر مسلط ہوتا دیکھ کر اپنی زندگی کا ثبوت دینا چاہا، مگر خود اس کے فرزندوں نے اسے ایک نامعلوم مدت کے لیے غلامی کی بیڑیاں پہننے پر مجبور کر دیا۔ یہ کمپنی گورنمنٹ کی تاریخ میں پے در پے غلطیوں، حریصانہ کوششوں اور غیر معمولی لوٹ کا ظالمانہ دور ہے۔ اس کے ہیرو آکلینڈ، ڈلہوزی اور لارڈ لارنس ہیں۔

اس صحبت کی گفتگو کا موضوع صرف آخر الذکر چار دوروں کی تاریخ کا مطالعہ ہے۔ جس میں ہندوستان کی معاشی تباہی کے خونین واقعات ہیں، پہلا دور خارج از بحث ہے، اس کو ہندوستان کے معاشی مستقبل کی تباہی سے بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو صرف اتنا ہے جتنا ایک ڈاکٹر کو کسی مریض کی موت سے ہوتا ہے۔

اٹھارھویں صدی سے پہلے

لیکن کمپنی کے تباہ کن اثرات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اٹھارھویں صدی سے پہلے کے ہندوستان کو دیکھنا چاہیے کہ اس وقت اس کی کیا حالت تھی، کیونکہ کسی موثر کے اثرات پوری طرح اسی وقت معلوم ہوسکتے ہیں، جب متاثر کی بیش از تاثر حالت پوری طرح معلوم ہو۔ بغیر اس کے اثر کی نوعیت و کمیت پوری طرح متحقق نہیں ہوسکتی۔

اکبر اور شاہجہان کے وقتوں کا تو ذکر ہی نہیں، کہ یہ زمانے ہندوستان کی ایسی خوش حالی کے تھے جن کو معاشیات کے صحیح نقطہ نظر سے دیکھا جائے، تو

آج ان کی نظیر دنیائے مغرب کے خوشحال ترین ملکوں میں نہیں مل سکتی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمپنی گورنمنٹ کے عہد سے وہ وقت بھی بدرجہا بہتر تھا جب حکومت کی باگ اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے ہاتھ میں تھی اور جب کسی مستقل نظام حکومت کے نہ ہونے سے سارے ملک پر بدامنیوں' خانہ جنگیوں' طوائف الملوکیوں کا راج تھا۔ صنعتیں برباد ہو رہی تھیں۔ اہل ہنر کا کوئی قدردان نہ تھا۔ لوگ خوش حالی کو ترسنے لگے تھے۔ اگلے وقتوں کو یاد کر کر کے روتے تھے۔ تاہم اس تباہی بخش و پراز اضطراب زمانے میں بھی ہر قسم کی صنعتی پیداوار کی اتنی کثرت تھی کہ نہ صرف گھر کی ضروریات ہی پوری ہوتی تھیں' بلکہ باہر کی ضرورتیں بھی یہیں سے پوری ہوتی تھیں' لاہور' کشمیر' برہان پور' پٹن' سنار گاؤں' آگرہ' فتحپور' بنارس' ست گاؤں' تنجور' ٹانڈا' کرناٹک' والورد' چتیاپٹم' بنگلور' کولار' سلاگوٹا' سیرا' پٹنہ' شاہ آباد' بھاگلپور' گورکھپور' دیناج پور' پرنیا' صنعتوں کے گھر اور تجارتوں کے مرکز تھے۔ جہاں سے دور دراز ملکوں کے تاجر لاکھوں کا سامان خرید کر لے جاتے تھے۔ قاسم بازار' بنگال کا ایک معمولی تجارتی مرکز تھا' مگر وہاں بھی اتنی بکری تھی کہ ۲۲ لاکھ پونڈ سالانہ صرف ریشمی کپڑے کی برآمد تھی۔ ۱۷۵۳ء میں ہسٹنگز معمولی کلرک کی حیثیت سے کمپنی کی کوٹھی میں ملازم ہو کر یہاں آیا تو اس نے تعجب کے ساتھ دیکھا کہ "پوری بستی ریشم اور ہاتھی دانت کا کام کرنے والوں سے آباد ہے... اور سب نہایت خوش حال ہیں۔" ڈھاکہ کی سب سے بڑی تجارت ململ اور چکن کی تھی' کیونکہ یہ دونوں چیزیں یہاں سے اچھی کہیں اور نہ بنتی تھیں اور صرف ان ہی دونوں کی سالانہ برآمد دو کروڑ تھی جو بعد میں (۱۷۷۸ء) گھٹ کر ایک کروڑ رہ گئی۔ جس میں ۳۰ لاکھ کی چکن کا خریدار انگلستان تھا۔ فرانس میں ہندوستان کے ریشمی کپڑوں کی اتنی مانگ تھی کہ اونچی ناک والے انگلستان کے ریشمی

کپڑوں کو کئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ مسٹر جوزف کا بیان ہے کہ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۹ء تک صرف سات برسوں میں فرنچ تاجروں نے ہندوستانی ریشمی رومال ۸۹۴۶۰۰ پونڈ کے خریدے جو بازار میں جاتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ حالانکہ انہی سالوں میں انگلستان کا کل ریشمی کپڑا فرانس میں ۱۷۷۹۰۰ پونڈ کا خریدا گیا۔

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں جب ہندوستان میں کمپنی گورنمنٹ نے اور انگلستان میں برٹش گورنمنٹ نے دیسی صنعت و تجارت کو تباہ و برباد کر دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا' ۱۸۴۷ء تک ہندوستان جزائر برطانیہ کی ضروریات زندگی کا چوتھا حصہ پورا کرتا تھا۔ اس چوتھے حصہ کا سرسری اندازہ اس امر واقعہ سے ہوسکے گا کہ ہر سال صرف سوتی کپڑے کی ۱۵ ہزار گانٹھیں کلکتہ سے انگلستان جاتی تھیں۔ جن میں کم و بیش ۳۰۶۰۸۶ تھان ہوتے تھے۔ فرانس' امریکہ' اسپین' پرتگال' ڈنمارک' ماری شس اور سواحل خلیج فارس و ممالک عرب آخر تک ہندوستانی مال کے گر کر لینے والے گاہک تھے۔ ۱۸۵۸ء تک ان ملکوں کو ۱۰۸۲۲۴۸ پونڈ کا ریشمی کپڑا جاتا تھا اور انتہا یہ ہے کہ ۱۸۸۵ء تک باوجود سخت قیود کے خود انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کے بکثرت خریدار موجود تھے' حالانکہ اس زمانہ میں کمپنی کے ہاتھوں یہاں کی صنعت بالکل تباہ ہوچکی تھی۔

صنعت سے زیادہ زراعت میں ہندوستان ضرب المثل تھا' ساری دنیا میں اس کی قدرتی پیداواروں کی شہرت تھی' فصلیں اتنی ہری بھری اور سیر حاصل ہوتی تھیں کہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے مالک بھی نہال رہتے تھے اور ارزانی کا یہ عالم تھا کہ اناج کی کوئی قیمت ہی نہ سمجھی جاتی تھی' بڑے بڑے کنبے دس دس پانچ پانچ روپے مہینے کے اناج میں پلتے تھے' چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں دو چار کی جنس سر آتی' پاؤں جاتی تھی۔

اقتباسات ذیل میں ان بیانات کی تصدیق کریں گے جو اپنوں کی من مانی تعریفیں نہیں، غیروں کے کم سے کم اعترافات ہیں۔:

ولیم ویری لسٹ (Villiam Varelst) جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی گورنروں میں تھا، لکھتا ہے "بنگال کے ریشمی کپڑے اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے، اسی وجہ سے دور دور ان کی مانگ ہے... اصفہان تک جاتے ہیں... لاکھوں کی نکاسی ہے۔"

مسٹر کارڈس نے ۱۸۳۳ء میں پارلی منٹری سب کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی ذہانت بعض صنعتوں میں بے نظیر ہے، ململ، شال، چکن، ریشمی رومال، سونے چاندی اور ہاتھی دانت کا کام اتنا نفیس اور لاجواب ہوتا ہے کہ برطانوی صناع اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

لارڈ مکالے بنارس کے ریشمی کپڑوں کی تعریف میں لکھتے ہیں "وہ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ لوگ سینٹ جیمز اور سلز کے رقص خانوں میں انہیں فخریہ پہن کر جاتے ہیں۔"

پروفیسر لیکی لکھتے ہیں "سترھویں صدی کے نصف آخر تک انگلستان میں ہندوستانی ململ، چھینٹ اور ایک خاص قسم کے چھپے ہوئے کپڑوں کی اتنی مانگ تھی کہ اس کی وجہ سے انگلستان کے ادنیٰ اور ریشمی جلاہوں کی روزی خطرے میں پڑ گئی تھی۔"

گرےفن لکھتا ہے "باہر کے تاجر ہر سال لاکھوں روپے کی شالیں کشمیر اور لاہور سے لے جاتے ہیں، آگرہ کا قالین اپنی خوبیوں میں ایرانی قالین سے کم نہیں ہوتا، برہان پور، پٹن، اور سنگار گاؤں کا سوتی کپڑا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ خاص کر سنار گاؤں کی ململ اتنی اچھی، نرم اور باریک ہوتی ہے کہ دوسری جگہ کے ریشمی کپڑوں کو مات کرتی ہے۔"

مانٹ گمری مارٹن (Montegomri Martin) لکھتا ہے "میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے وہ جتنا زراعتی ہے اتنا ہی صنعتی بھی ہے... وہ ایسا صناع ملک ہے' جس کی صنعتیں مدتوں سے زندہ ہیں اور جہاں کہیں ان کو شریفانہ مقابلہ کا موقع ملا ہے وہ ہر قوم کی صنعتوں سے بہتر پائی گئی ہیں' اس سے میری مراد صرف ڈھاکہ کی ململ اور کشمیر کی شال ہی نہیں ہے' بلکہ وہ تمام مصنوعات ہیں جو ہر حیثیت سے دنیا کی مصنوعات پر سبقت لے گئی ہیں۔"

سر تھامس مانرو نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ "اگر کسی ملک کی تہذیب سے مراد اس کا بہترین طریق زراعت اور اعلیٰ درجہ کی صنعتی ذہانت ہے تو ہندوستان ایک اعلیٰ درجہ کے مہذب یورپین ملک سے کم نہیں ہے... وہاں کا مال یہاں آکر بہت فائدے دے گا... کیونکہ وہ بہت سستا' اچھا اور پائیدار ہوتا ہے' یہ خوبیاں یورپین مال میں نہیں ہیں۔"

صناعات ہند کی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کا آغازی جملہ ہے "جبکہ جدید صنعتوں کا وطن' مغربی یورپ' وحشی قبائل کا مسکن تھا' ہندوستان نہایت متمدن تھا اور اس کی صنعتی قابلیتیں ساری دنیا میں مشہور تھیں' جب مغربی تاجروں نے پہلے پہل یہاں قدم رکھا تو اس وقت یہاں کی صنعتی حالت یورپ کی کسی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم سے کم نہ تھی۔" (۱۹۱۸ء)

اس صنعتی ذہانت' اس تجارتی چہل پہل' اور اس زراعتی سرسبزی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہر شخص خوشحال تھا' بیکاری سے کوئی آشنا نہ تھا' مرد عورتیں' بچے بوڑھے سب کام سے لگے ہوئے تھے۔ خالی بیٹھنا عیب سمجھتا جاتا تھا' ہر چیز ارزاں تھی' بازار بہترین ملکی مصنوعات سے پٹے پڑے تھے' اور کہیں

ڈھونڈھے سے بھی باہر کی چیزیں نہ ملتی تھیں' منڈیوں میں غیر ملکی تاجروں کے گماشتوں کا میلا لگا رہتا تھا۔ کسان دولت مند تھے' افراد کی دولت کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا' اجتماعی دولت بے اندازہ تھی' ڈاکٹر روبرٹسن لکھتا ہے "ایک خوشحال زندگی کے لیے جتنے بے نیاز ہندوستانی ہیں' شاید روئے زمین پر کہیں اور کے باشندے نہ ہوں گے' عمدہ آب و ہوا' زرخیز زمین' اور اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی مفید ذہانت' یہ سب ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ جس بات کی خواہش کرتے انہیں مل جاتی... دور دور کی دولت یہاں بھی چلی آتی ہے' اور اس کے بدلے یہاں کی صنعتی پیداواریں وہاں جاتی ہیں۔"

۱۸۲۸ء کے ایسٹ انڈیا گزٹ میں والٹر ہملٹن نے (نیم سرکاری حیثیت سے) لکھا تھا "جعفر خان اور شجاعت خان کی چہل سالہ گورنری میں بنگال نہایت سرسبز و شاداب تھا' دہلی کی مرکزی حکومت کو ایک کروڑ سالانہ خراج بھیجا جاتا تھا' مگر لوگوں کو ٹیکس ذرا بھی گراں نہ ہوتے تھے' زمیندار اتنے مالدار تھے کہ علی وردی خاں کو (غصب حکومت کے بعد) ایک کروڑ کا نذرانہ دیا' اور جب مرہٹوں کی مدافعت کے لیے روپے کی ضرورت ہوئی تو فوراً پچاس لاکھ روپیہ جمع کر دیا۔"

کلائیو جب پہلے پہل مرشد آباد گیا تو وہاں کی دولت و ثروت کو دیکھ کر حیران رہ گیا لکھتا ہے۔ "یہ شہر لندن کے برابر وسیع' آباد اور دولت مند ہے' مگر فرق یہ ہے کہ یہاں عام آبادی کی دولت اتنی ہے جتنی وہاں شاید خاص آبادی کی بھی نہ ہو۔"

جارج اسمتھ نے مدراس کی دولت مندی کے متعلق ہاؤس آف کامنز سب کمیٹی کے سامنے کہا کہ : "جب میں وہاں گیا تو وہ نہایت خوشحال اور ہندوستان کے بہترین مقامات میں سے تھا... کرناٹک کا علاقہ نہایت سرسبز و

شاداب' آباد پر ثروت اور تجارت کا مرکز بنا ہوا تھا' آبادی کی عام حالت بہت اچھی تھی۔" (۱۸۶۷ء)

منتبور کی دولت کے متعلق مسٹر پٹری نے اس کمیٹی کے سامنے کہا کہ " یہ علاقہ اندرونی و بیرونی تجارت کا مرکز تھا' بنگال سے ریشم' بمبئی اور سورت سے روئی' سماٹرا اور ملاکا وغیرہ مشرقی جزائر سے شکر اور مسالے' پیگو سے سونا' گھوڑے' ہاتھی' شہتیر اور چین سے مختلف چیزوں کی درآمد تھی' اور ان کے بدلے یہاں سے ململ' چھینٹ' رومال' ڈوریا' دھوتیاں اور ایک خاص قسم کا چھپا ہوا کپڑا اور اسی قسم کی دوسری چیزیں افریقہ' امریکہ (جنوبی) اور جزائر عرب الہند تک جاتی تھیں... زراعت کی حالت بہت اچھی تھی' کوئی کھیت آب پاشی سے محروم نہ تھا' نہریں' تالاب اور کنوئیں اس کثرت سے تھے کہ زمین کا ایک ایک چپہ سیراب تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس زمانے میں ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا شاداب نہ ہوگا۔"

اسی لیے ایک دنیا اپنے کاشانہ "امن و راحت" پر اس خانہ جنگیوں کے گھر کو ترجیح دیتی تھی' جن میں سے ایک برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی بھی تھی۔ ورنہ "بہترین فائدے اور بکثرت دولت" کے متلاشیوں کو کیا پڑی تھی کہ یہاں آتے اور اس کے سدھارنے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے؟ ایف جی شور لکھتا ہے: "ہماری حکومت کا مقصد ہر ممکن طریقے سے ہندوستان کو لوٹ کر اپنا پیٹ بھرنا' اور اس کو حد سے زیادہ محصولوں کے بوجھ کے نیچے دبا دینا ہے' ہمارے بھائی انگلستان سے صرف اس لیے یہاں آتے ہیں کہ یہاں سے بہت سا روپیہ لے کر جائیں' اور اسی لیے ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی والیان ریاست کے مقابلہ میں بہت زیادہ ٹیکس وصول کرتے ہیں۔"

بروکس آدم لکھتا ہے "دولت مند ہندوستان کی بے شمار دولت نے ایک طرف ہمارے نقد قومی سرمایہ میں غیر متوقع اضافہ کر دیا' اور دوسری طرف اہل ہنر کی ہمتیں بڑھا کر ترقی کی رفتار تیز کر دی۔ جنگ پلاسی کے بعد بنگال کی لوٹ لندن پہنچنی شروع ہوگئی اور اس نے فوراً اپنا اثر دکھایا... انیسویں صدی کو جس حرفتی انقلاب نے اپنے ماقبل سے جدا کر دیا' وہ ۱۷۶۰ء سے شروع ہوتا ہے' جبکہ پلاسی کی جنگ ختم ہو چکی تھی' یہ انقلاب جتنی تیزی سے ہوا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے... شاید اس دنیا میں آج تک کسی قوم کو کسی کام نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا فائدہ انگلستان کو ہندوستان کی دولت مندی نے پہنچایا ہے۔"

اس دولت مندی کی کیا مقدار تھی؟ ولیم ڈگبی لکھتا ہے "اس کا صحیح اندازہ مشکل ہے! لیکن گمان غالب ہے کہ وہ رقم جو پلاسی اور واٹرلو کے معرکوں کے درمیان ہندوستان سے انگلستان کے بنکوں میں منتقل ہوئی' کروڑوں پاونڈ یا ایک ارب پونڈ سے کم نہ تھی۔

تمام شریف اور ایمان دار انگریز' ہندوستان کے اس احسان کو مانتے ہیں' سر جارج برڈوڈ (Georgi Barvord) نے لکھا ہے "ہم تا ابد ہندوستان کے ممنون رہیں گے... اس نے کرۂ ارض کے ان جزیروں (انگلینڈ) جو جزائر جاپان کی طرح غیر معروف تھے' گمنامی کے پردہ سے نکال کر دنیا کی عظیم ترین سلطنت بنا دیا۔"

تباہ کن اثر

لیکن کمپنی گورنمنٹ کے آتے ہی یہ ہوا بالکل بدل گئی' اہل حرفہ کے گلے گھونٹ دیئے گئے۔ صنعتیں بیٹھ گئی' تجارت کی کساد بازاری ہوگئی' زراعت پر اوس پڑ گئی' کسانوں پر عرصہ زندگی تنگ ہوگیا۔ زرعی و صنعتی روح بے

دردی سے کچل ڈالی گئی۔ اور ظالم خود غرضوں نے اس غریب کو ضرورت کی ایک ایک چیز سے محتاج کر کے' اپنے ملک کی فلاح کے لیے خام پیداوار کی ایک ایسی قحط زدہ منڈی بنا دیا کہ "تنہا زرعی ملک" کا جفاکش کسان' آج دنیا میں سب سے زیادہ محنتی ہونے کے باوجود سب سے زیادہ مفلس ہے' اور انتہا یہ ہے کہ غریب اپنے اس خرمن کے کم از کم فوائد سے بھی محروم ہے' جسے وہ اپنے خون سے سینچتا ہے۔

اتنی جلدی ایسا عظیم الشان انقلاب کیسے ہوگیا؟ اس کا جواب غارت گروں کی جماعت کے اعلیٰ افسروں کی زبان سے سنئے "سر ہنری اسٹر تیجی نے ۱۸۱۳ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کے سامنے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "بنگال کی تجارت کا ایک بڑا حصہ پچاس برس سے بالکل یورپین بنکوں میں ہے... مزدوروں اور کاری گروں کو نہایت قلیل اجرت پر کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے' وہ بات بات پر مارے اور باندھے جاتے ہیں۔"

اسی سنہ میں سر تھامس مونرو نے دارالعلوام کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے بیان کیا کہ "جلاہوں کو زبردستی کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے' انہیں کمپنی کے کارندے قید کر کے ان پر سپاہی مسلط کر دیتے ہیں... اگر کام میں دیر ہو جاتی ہے تو ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔"

سر چارلس ٹریولن (Charlestriualean) نے ۱۸۴۰ء میں دارالعوام میں سلیکٹ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "ڈھاکہ' جو کسی زمانے میں ڈیڑھ لاکھ آبادی کا ایک پر رونق شہر تھا' اب ۳۰' ۴۰ ہزار نفوس کا بدحال قصبہ ہے' پہلے وہاں ململ اور چکن بنانے والے رہتے تھے اب وہ رہتے ہیں جو افلاس اور ملیریا کا شکار ہیں۔"

ولیم بولٹس اپنے چشم دید واقعات بیان کرتا ہے "ملک کی اندرونی

تجارت ظلم و جور کا افسوسناک منظر پیش کرتی ہے' اس کے مسموم اثرات کو ہر جلاہا محسوس کر رہا ہے' ملک میں جتنا مال تیار ہوتا ہے سارا کمپنی کا اجارہ ہے' کمپنی کے کارندے خود ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کس کو کتنا مال تیار کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی اس کے معاوضہ میں وہ کتنی اجرت پانے کا مستحق ہے' اگر وہ اس اجرت پر کام نہیں کرتا' تو اسے ہنٹر سے مارا جاتا ہے' اور قید کر دیا جاتا ہے' ... یہ لوگ عموماً ۱۵ فی صدی اور کبھی ۴۰ فیصدی اجرت مقرر کرتے ہیں اور پھر ان غریبوں کو اتنی اجازت بھی نہیں دیتے کہ وہ کسی دوسرے کا مال تیار کریں۔ کم از کم اپنی ضروریات ہی کو پورا کریں' اگر وہ کسی وجہ سے کمپنی کا کام کرنے سے انکار کرتے ہیں' تو ان کا مال ضبط کر کے نیلام کر دیا جاتا ہے۔"

مانٹ گمری مارٹن لکھتا ہے "ہندوستان کی تجارت کو نہ صرف انگلستان بلکہ تمام ممالک کے ساتھ بڑی بے انصافی سے بند کیا گیا ہے... ہم نے ایک چوتھائی صدی میں ہندوستان اور اس کی صنعتیں مٹا کر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہماری مصنوعات خریدے' ہم اپنا مال تو ہندوستان میں درآمد کرتے ہیں' مگر ہم نے اپنے ہاں ہندوستانی مال پر ۱۰ فیصدی سے ۱۰۰ فیصدی تک کے محصول عائد کر رکھے ہیں... سورت' ڈھاکہ اور مرشد آباد وغیرہ صنعتی مقامات جس طرح تباہ کر دیئے گئے اس کا ذکر نہایت افسوسناک ہے۔"

ولسن لکھتا ہے "یہ ایک واقعہ ہے کہ انگریزی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہندوستانی صنعت کو انتہائی ناانصافی سے مٹایا گیا ہے' اگر برطانوی صناع' ہندوستانی صناع سے صرف صناع کی حیثیت سے مقابلہ کرتا تو ہرگز کامیاب نہ ہو سکتا۔"

شور لکھتا ہے: "ہندوستان کے اچھے دن گزر گئے' وہ دولت جس کا کبھی وہ مالک تھا لوٹ لی گئی' وہ قابلیت و ذہانت جس کا دنیا جہاں میں شہرہ تھا' تباہ

و برباد کر دی گئی' اور ظالمانہ طریق حکومت سے اس کے فوائد کو اپنے فوائد پر قربان کر دیا گیا۔"

لیکن سب سے زیادہ درد انگیز زراعت کی تباہی ہے' جس نے اس بدنصیب ملک کے باشندوں کو جانوروں سے بھی بدتر کر دیا ہے۔ آج اس کے بچے' معصوم بچے' مٹھی بھر اناج کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہیں اور نہیں پاتے' سسکتے ہیں اور مرجاتے ہیں! اس زمانہ کا معمولی کسان وہ ہوتا تھا جس کے پاس دو بیل' ۵۰ گائیں' چھ سات بھینسیں اور تقریباً ۱۰۰ بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں' فاقہ اور تنگ دستی کا وہ نام بھی نہیں جانتا تھا' اس میں اتنی مقدرت ہوتی تھی کہ آب پاشی کی تمام ضروریات خود مہیا کرلیا کرتا تھا' نہروں اور تالابوں کی مرمت عموماً وہ خود ہی اپنے صرف سے کیا کرتا تھا' چین اور روحانی طمانیت کی مسرت اس کے لیے پر ہمہ وقت کھیلتی رہتی تھی' حکومت کا برتاؤ اس کے ساتھ نرم تھا' مال گزاری منافع کی چوتھائی حد تک یا تہائی (جو اصل پیداوار کا دسواں حصہ ہوتی تھی) لی جاتی تھی' وقت بے وقت اس کی مدد کی جاتی' قحط کے زمانے میں مال گزاری کم کر دی جاتی یا بالکل ہی نہ لی جاتی' اور بقایا کے متعلق تو ہمیشہ یہ ہوا کہ معاف کر دیا گیا' مگر کمپنی گورنمنٹ کے عہد میں یہ کبھی نہیں ہوا' اس نے آب پاشی پر کبھی ایک پیسہ خرچ نہ کیا' اور مزارعین پر ہمیشہ سختی کی۔ اس نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا ہے تو یہاں گوشہ گوشہ میں آب پاشی کے ایسے ذرائع موجود تھے کہ اگر وہ ان کو بحال رکھتی تو اس ملک کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا' لیکن اس کی تاریخ ایسے واقعات سے شرمندہ نہیں ہے' اس نے اس ملک کی آمدنی کو اس ملک پر لگانے کے بجائے اپنے منافع پر لگایا' اور اس ملک کو تباہ و برباد کر دیا' اس کی حکومت کے پہلے ۲۵ سال میں پانچ' دوسرے میں دو' تیسرے میں چھ اور چوتھے میں اٹھارہ قحط پڑے' جن میں ۳ کروڑ ۲۵ لاکھ جانیں ضائع ہوئیں۔ اس

کی وجہ سے زراعت میں غیر معمولی کمی ہوگئی۔ مزارعین خانماں برباد ہوگئے۔ مگر مال گزاری کو معاف کرنا تو الگ رہا' نہایت سختی سے وصولی کی گئی۔ ۱۷۶۹ء میں جبکہ سارا بنگال قحط سے متاثر تھا۔ وصولی میں مار پیٹ سے کام لیا گیا۔ ۱۷۷۰ء کا قحط جس نے آبادی کا تیسرا حصہ ہلاک کر دیا' مال گزاری کی فطری کمی کو دوسرے سال کی ناجائز بیشی سے پورا کیا گیا اور اس پر اظہار مسرت کیا گیا کہ باوجود سال گزرنے کے شدید قحط اور نقصان آبادی کے' سال رواں کے بندوبست میں قابل لحاظ بیشی ہوئی ہے۔ "قابل لحاظ بیشی" کا یہ ظالمانہ سلسلہ برابر جاری رہا' جو اتنا بڑھ گیا کہ حاصلات کے نصف پر وصول کیا جانے لگا' اور "بیش از بیش" کی ہوس نے اس پر بھی بس نہ کی' اور مختلف قسم کے ٹیکس لگا کر وصولی کی مقدار کو ۶۰ اور ۶۵ فیصدی اور کہیں ۸۴ فصدی تک پہنچا دیا۔ کمپنی کا ایک افسر مال کہتا ہے "موجودہ شرح مال گزاری بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے ملک کے کسانوں کی حالت بہت افسوسناک ہوگئی ہے۔ انہیں ایسی حالت میں زمینیں جوتنی پڑتی ہیں' جب ان کے پاس اس کا سامان تک نہیں ہوتا' مگر کمپنی تمام قابل کاشت زمینوں سے مال گزاری وصول کرتی ہے۔ خواہ وہ جوتی گئی ہوں یا نہ جوتی گئی ہوں یا نہ جوتی گئی ہوں' مسٹر اسمی کا اندازہ ہے کہ "زمینداروں سے عام طور پر جو مال گزاری وصول کی جاتی ہے' وہ ان کے زرلگان کا ۸۴ فیصدی حصہ ہوتی ہے' جسے اگر وہ ادا نہ کرسکیں تو گرفتار کر کے حوالات میں بھیج دیئے جاتے ہیں' اور اس وقت تک رہا نہیں ہوتے جب تک کمپنی کی مطلوبہ رقم ادا نہ کر دیں۔" کرنل برگس اس تباہ کن قانون مالگزاری کے مضر اثرات سے متاثر ہو کر لکھتا ہے کہ "ایسی مال گزاری جو آج کل ہندوستان میں مقرر ہے' زمیندار کی پوری آمدنی چٹ کر جاتی ہے' یورپ یا ایشیا کی کسی حکومت میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔" اس معاشی ظلم نے ہندوستانی کسان

کو ختم کر دیا' اس میں جان نہ رہی' چہرے پر مصیبت و فلاکت برسنے لگی' قرض میں بوٹی بوٹی بندھ گئی' اور غریب پیسہ پیسہ سے محتاج ہو کر ان حالوں کو پہنچ گیا کہ اس کے بچے بھوکوں مرنے اور اجاڑوں میں ٹھٹھرنے لگے' پہلے وہ ایک فصل بوتا تھا اور چین سے زندگی بسر کرتا تھا' اب وہ بارہ مہینے اپنی ہڈیاں پیلتا' اور خون پسینہ کر کے ٹپکاتا ہے مگر پھر بھی روٹی کپڑے کو محتاج رہتا ہے' پہلے وہ فرصت کے دنوں میں دستکاری بھی کیا کرتا تھا' لیکن اب دن رات بیگار میں جان مارتا ہے' مسٹر ولیم لارنس نے لکھا ہے "کسان جو اس ملک کا کاشتکار بھی ہے' اور دست کار بھی' کمپنی کے گماشتوں کے مظالم سے تنگ آگیا ہے' جب وہ کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے' تو اسے کاشت کا موقع نہیں ملتا' اور مال گزاری کی ادائی دشوار ہو جاتی ہے لیکن وہ غریب اس پر مجبور ہے۔ اس لیے جب اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو کبھی تو وہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور کبھی اپنے بال بچوں کو بیچ دیتا ہے۔"

یہ حقیقت کس قدر تلخ و افسوس ناک ہے' جو ملک دنیا کا بہترین صنعتی ملک ہو' جس کی مصنوعات سارے جہان کی مصنوعات پر سبقت لے گئی ہوں' جس کی خام پیداوار کا دور دور شہرہ ہو۔ جہاں اجناس کی اتنی ریل پیل ہو' کہ ایک کمانے والے پر گھر کے گھر پلتے ہوں' جس کی زمین سونا اگلتی ہو' اور جہاں دولت کی نہریں بہتی ہوں' وہ ملک ایک صدی کے اندر اندر اتنا مفلس' اتنا قلانچ' اتنا بدحال اور ہلاکت زدہ ہو جائے کہ اس کی آبادی کا ایک تہائی حصہ نان شبینہ کو محتاج ہو' اور پوری نصف آبادی جاڑے گرمی میں ڈھنگ کا کپڑا نہ پہن سکے؟ کیا کسی قوم کے لیے جو انصاف' انسانیت' شرافت' تہذیب اور بنی نوع انسان کی ہمدردی و غم خواری کی بلند بانگ دعویدار ہو' اس سے زیادہ کوئی بات شرمناک ہو سکتی ہے؟ کبھی وہ جگر دوز صورت حال تھی جس کو دیکھ کر ایک درد

مند مورخ کا دل بھر آیا' وہ لکھتا ہے:۔

"یہ لوگ اس ملک کی خوشحالی سے بالکل بے پروا ہیں' ان کی حکومت میں ہر طرف مظلومیت کی چیخ و پکار ہے' آبادیاں بن ہوگئی ہیں' امیر غریب کوئی چین سے نہیں' صناع خانماں برباد ہیں' کھیت ہو حق کا میدان ہو رہے ہیں' مفلسی' مصیبت اور قحط نے شہ زوروں کو بے دم کر دیا ہے۔ اے خدا اپنے مظلوم بندوں کی مدد کو پہنچ اور ان کو ان مظالم سے بچا' اس جور و ستم سے نجات دے جو ہم نے کبھی دیکھے نہ سنے۔"

لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کسی ملک کی فلاکت و بدحالی' اس کے حکمرانوں کی نااہلی و بدکرداری کا نتیجہ ہوتی ہے تو ہمیں اپنے ملک کی اس افسوسناک حالت کو بھی کمپنی گورنمنٹ کے نظام کار' اصول حکومت اور مطمح نظر میں تلاش کرنا چاہیے۔

کمپنی گورنمنٹ کا مطمح نظر

آپ جانتے ہیں اگر کوئی بنیا کسی ملک کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ کیا کرے گا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تاجروں کی ایک باقاعدہ جماعت تھی' جس کا مقصد اپنی تجارت کی حفاظت و ترقی' حریفوں کا استیصال' دولت کی لوٹ' دیسی صنعتوں کی بیخ کنی' اور اپنے ملک کی صنعت و تجارت کو فروغ دینا تھا۔ جب تک اس کے ہاتھ میں انتظامی قوت نہ تھی وہ امن پسند تاجر تھی اور مغل بادشاہوں کی عنایت سے خاص مراعات کے ساتھ وادی ہمالہ کے مختلف حصوں میں کاروبار کرتی تھی' اور تقریباً اسی کی وجہ سے وہ اپنے یورپین رقیبوں کو شکست دینے اور نکالنے میں کامیاب ہوئی' لیکن جنگ پلاسی کے بعد اس کا رویہ فوراً بدل گیا۔ اب آزاد تجارت کو وہ اپنا حق سمجھنے لگی اور مرکزی حکومت کو کمزور دیکھ

کر، ملک کے آئین و قوانین اور قوائے نظم و نسق کو اپنے تاجرانہ مفاد اور دولت کی "بیش از بیش" لوٹ مار کے تابع کر لیا۔ اس نے اپنی ساری توجہ اس میں مرکوز کر دی کہ ہندوستان کی صنعتی روح کو کچل ڈالے۔ اس کے نقد سرمایہ پر قبضہ کر لے، اور اس کو ایک فلاکت زدہ زرعی ملک بنا کر انگلستان کی مصنوعات کے لیے ایک اچھی منڈی بنا دے۔ اس نے دیسی تاجروں پر منڈیوں کے دروازے بند کر دیے، تمام صنعتوں کا اجارہ لے لیا۔ مقامی درآمد برآمد پر بھاری بھاری محصول عائد کر دیئے، دستکاروں کو طرح طرح کے محصولوں اور پابندیوں سے جکڑ دیا، قحط کے زمانے میں زمینداروں سے زبردستی سستا اناج، خرید کر مہنگا بیچنے لگی اور اس کے گماشتے اس طرح پھرنے لگے جیسے بادشاہ پھرتے ہیں، ان کا یہ وتیرہ تھا کہ دست کاروں سے چوتھائی قیمت پر مال خریدتے اور پنج گنی قیمت پر بیچتے، کمپنی اور اس کے کارندوں کی تجارت چنگی اور دوسرے محصولوں سے مستثنیٰ تھی اور دست کاروں کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنا مال کسی دوسرے کے ہاتھ نہ بیچیں۔ جو آفت کا مارا ایسا کرتا سخت سزائیں پاتا۔ غرض اس طرح بنگال کی ساری تجارت دیسی تاجروں سے ہاتھ سے نکل گئی اور صنعتیں ان کے مظالم سے مٹنے لگیں۔ کمزور میر جعفر تو یہ سب باتیں دیکھتا رہا، اور دم نہ مار سکا۔ مگر غیور میر قاسم سے چپ نہ رہا گیا۔ اس نے کمپنی کے اعلیٰ افسروں، گماشتوں اور کارندوں کی بدعنوانیوں کی بارہا شکایتیں کیں اور پھر صاف لکھ دیا کہ کمپنی کو اپنے کارکنوں کو ہدایت کرنا چاہیے کہ وہ اپنا رویہ بدلیں، میں اور میری حکومت اس سے زیادہ توہین برداشت نہیں کر سکتا لیکن جب اس پر بھی کچھ نہ کیا گیا تو اس نے اپنے علاقہ میں اندرونی تجارت پر محصول معاف کر دیا اور زبردست مالی قربانی کر کے دیسی تاجروں کی مدد کی۔ اس شرافت نفس اور وطن خواہی کی پاداش میں اسے عہد شکن قرار دیا گیا اور جنگ کر کے (۱۷۶۳ء)

تخت سے اتار دیا۔ پھر دو برس بعد "دیوانی" لے کر نوابی کا سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ جو بنگال کی رہی سہی خوشحال کے لیے فاقہ اور موت کا پیغام تھا۔

یہ تو صرف وہاں کا ذکر ہے' جہاں کمپنی صرف "دیوان" کی حیثیت سے متصرف تھی' وہاں کا ذکر نہیں جہاں مطلق العنان مالک تھی اور جہاں صناعوں کے لیے یہ دنیا دوزخ بن گئی تھی۔

لیکن کمپنی کی ظالمانہ کارروائیاں یہاں بھی ختم نہ تھیں' اس نے "زیادہ سے زیادہ روپیہ" حاصل کرنے کے جنون میں قول و قرار' انصاف و دیانت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا اور جنھوں نے احسان کیے تھے ان ہی کے گلے کاٹتی تھی' سراج الدولہ کو اپنی گون کا نہ دیکھ کر' جنگ کر کے اسے تخت سے اتار دیا (۱۷۵۷ء) اور اس کی جگہ ۳۲ لاکھ ۴۰ ہزار پونڈ کے بدلے میر جعفر کو بٹھایا' مگر جب وہ کمپنی کے آئے دن کے مطالبات پورے نہ کرسکا' تو اسے معزول کر دیا' اور میر قاسم کو بردوان' مدنا پور' چٹاگانگ کی آمدنی کے معاوضہ میں "گدی نشین" کیا گیا۔ پھر اس سے کرناٹک کی جنگ کے لیے پانچ لاکھ روپے مانگے' جو اس نے دے دیئے۔ یہاں تک وہ قابل تعریف تھا' لیکن بدقسمتی سے اس کو اپنے ملک سے محبت تھی۔ وہ اس کو خوشحال دیکھنا چاہتا تھا اور اس نے دیسی تاجروں کے فائدے کے لیے اپنے ممالک محروسہ میں اندرونی نقل و حرکت پر چنگی معاف کر دی تھی' جس کی وجہ سے دیسی تاجروں کو کمپنی کے مقابلہ میں منفعت بخش تجارت کا موقع مل گیا تھا۔ اس لیے اس کو اس جرم پر "بدعہدی" کی سزا میں تخت سے اتار دیا۔ (۱۷۶۳ء) اور ۵۳ لاکھ سالانہ پنشن کر کے حکومت بنگالہ کو اپنے انتظام میں لے لیا۔ جو چند سال میں ۱۶ لاکھ تک گھٹا دی گئی۔ شاہ عالم کو ۲۷ لاکھ سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا تھا' مگر ہسٹنگز کے زمانے میں اس کا ایفا فضول سمجھا گیا اور بند کر دیا گیا۔ ۱۷۶۵ء کے معاہدے کی

رو سے تنجور کا راجہ کمپنی کا اتحادی تھی، لیکن اس کی دولت پر اس کا دانت تھا، محمد علی نواب کرناٹک کو جو کمپنی اور یورپین مہاجنوں کا بہت مقروض تھا، تنجور کے لوٹنے پر آمادہ کیا۔ راجہ نے ۴ لاکھ پونڈ دے کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر پذیرائی نہ ہوئی، سینٹ جارج کے ارباب حل و عقد یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ "صوبہ مدراس کے عین قلب میں ایسی قوت کا موجود ہونا سخت خطرناک ہے۔" اس بنا پر ۶ر ستمبر ۱۷۷۳ء کو تنجور کا آخری فیصلہ کر دیا گیا، کورٹ آف ڈائریکٹرز نے جن وجوہ کی بنا پر اس کی منظوری دی ان سے ایک حد تک کمپنی کا نقطہ نظر واضح ہوتا ہے، اس نے لکھا "یہ بات بہت ہی غیر معقول معلوم ہوتی ہے کہ راجہ تنجور ملک کے ایک ایسے زرخیز علاقہ پر قابض رہے جو تنہا ایک پورے لشکر کے مصارف برداشت کر سکتا ہے... ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم راجہ پر زور ڈالنے کے لیے نواب کی مدد کرو... امید ہے کہ اس سلسلے میں جو رقم ہاتھ آئے گی، اس سے نواب کے کل قرضے بے باق ہو جائیں گے۔" ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ سے بنارس کا علاقہ لے کر راجہ چیت سنگھ سے ۵۰ ہزار پاونڈ کا مطالبہ کیا، اور جب اس نے یہ رقم بے چوں و چرا دے دی تو ۵ لاکھ کا اور مطالبہ کیا، جسے وہ پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اسے اس "معقول" جرم کی سزا میں قید کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک کمزور آدمی کو اس شرط پر گدی نشین کیا کہ وہ مقررہ خراج کے علاوہ مزید رقموں سے بھی مدارات کرتا رہے گا۔ اسی زمانہ میں آصف الدولہ سے ۱۲ لاکھ پونڈ کا مطالبہ کیا، اور اس کی ادائی کے لیے اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنی ماں اور دادی کے خزانوں پر قبضہ کر لے، حالانکہ ان کی حفاظت کی کمپنی خود ضامن ہوئی تھی، اور آخر کمپنی کی فوجوں نے فیض آباد پہنچ کر بیگموں کو محل میں قید کر دیا اور ان کے خزانچیوں کو لکھنؤ لے جا کر زبردستی ۱۲ لاکھ پونڈ وصول کیے، کنارا کے راجہ کو کمپنی کے

افسروں سے شکایات تھیں' جب تھامس مانرو اس علاقہ میں بندوبست کے لیے گیا تو کنارا کے ولی عہد نے اس سے مل کر اپنی حکومت کی شکایات پیش کیں' مانرو نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ راجہ کے مطالبات کمپنی کے سامنے پیش کر کے اس کے حسب دلخواہ فیصلہ کرا دے گا۔ مگر عملاً یہ کیا گیا کہ راجہ کے تمام اختیارات سلب کر کے اس کے علاقہ کو اپنے انتظام میں لے لیا اور راجہ کو مدد معاش کے لیے تھوڑی سی جاگیر دے دی۔

غرض یہ تھا کمپنی کا مطمح نظر' یہ تھے اس کے اعمال' اور یہ تھے ان کے تباہی بخش اثرات' حکومت کا مقصد نہ تھا مگر روپیہ' اس کی طرف سے اجازت تھی کہ "جو چاہو کرو مگر روپیہ بہت بھیجو" عمال پہلے ہی یہاں کی دولت کو دیکھ دیکھ کر للچا رہے تھے' پروانگی ملتے ہی کھل کھیلے' لوٹ مار میں کوئی کور کسر اٹھا نہ رکھی۔ جو نہ کرنا تھا وہ کیا' خود ڈائریکٹران کو بھی ان ناکردہ کاریوں کا اعتراف ہے' انہوں نے لکھا ہے "یہ بے پایاں دولت ایسے جابرانہ' غاصبانہ طریقوں سے حاصل کی گئی ہے جو کسی ملک اور کسی عہد کی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

کیا یہ واقعات ایسے نہیں ہیں کہ ان پر انسانیت خون کے آنسو بہائے؟ یہی وہ تباہ کن معاشی غارت گری اور موت آفریں اقتصادی لوٹ تھی' جس نے ہندوستان کو ان حالوں کو پہنچا دیا ہے۔ اونچی ناک والے انگلستان کو اپنے اولین اقدام کے یہ خونیں واقعات یاد کر کے شرمانا چاہیے۔ (اب برصغیر کے آزاد باشندوں کو 'جدید ایسٹ انڈیا کمپنی' کی اقتصادی لوٹ مار سے سبق حاصل کرنا چاہیے' یہی ایک راہ ہے جس پر چل کر وہ مغرب کے حالیہ اقتصادی تسلط کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ البتہ انہیں اپنے گھر کے "دشمنوں" سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔ (ادارہ)